R.No. 2196/57 — Regd No. L922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۴ - شمارہ - ۴ | ایڈیٹر - آل احمد سرور | ۲۲ جنوری ۱۹۶۴ء

اداریہ

یوم جمہوریت

۲۶ جنوری پھر آگیا۔ گذشتہ سال اس موقع پر چین کے حملے کی وجہ سے قدرتی طور پر ہمارے سامنے سب سے اہم سوال ملک کی سالمیت کی حفاظت اور اس کی طاقت بڑھانے کا تھا اور ہماری ساری توجہ اسی اہم نکتے پر مرکوز تھی۔

اگرچہ ابھی ہنگامی حالات ختم نہیں ہوئے ہیں اور چین کی طرف سے خطرہ باقی ہے اور اس لئے ہمیں ہر وقت چوکنا رہنا ہے، مگر اس عرصے میں یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ چین نے جو جارحانہ اقدام ہمارے خلاف کیا، اس کی وجہ سے دنیا کی محفلوں میں اس کی خاصی رسوائی ہوئی ہے اور اب وہ آسانی سے اس کی جرأت نہ کرے گا کہ پھر کوئی ایسا قدم اٹھائے جس کی وجہ سے اسے مزید رسوائی کا سامنا کرنا پڑے۔

ان حالات میں ہمارا فرض کیا ہے؟ ایک طرف ہمیں اپنی دفاعی طاقت کو بڑھانا ہے، تاکہ خدانخواستہ اگر ضرورت پڑے تو ہم اپنے ملک کی اچھی طرح حفاظت کر سکیں، دوسری طرف ہم دفاع کی مجبوریوں کی وجہ سے اپنے ترقیاتی منصوبوں کو پس پشت نہیں ڈال سکتے، بلکہ ان منصوبوں کی کامیابی کی وجہ سے چونکہ دفاع کی طاقت بھی بڑھتی ہے، اس لئے ان کی رفتار کو اور تیز کرنا ہے۔

ان دونوں پہلوؤں کے لئے ہمیں ملک میں مکمل اتحاد و اتفاق اور یک جہتی کی ضرورت ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ کسی کے بہکانے یا اشتعال دلانے سے بھی ہم کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے ملک کی یک جہتی کو کسی قسم کی ٹھیس پہنچے۔ اس کے لئے روزمرہ کے مسئلوں کو بھول جانے کی ضرورت نہیں، انھیں اس طرح پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ ان کے حل سے یک جہتی کو تقویت پہنچتی دکھائی دے۔ مثلاً اردو کا مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے کہ جن جن ریاستوں میں اردو کے ساتھ انصاف نہیں ہوا ہے، وہاں انصاف کی خاطر ہمیں اپنی آواز بلند کرنا ہے، مگر یہ آواز اس طرح بلند کی جائے کہ جمہوری عناصر کو ترقی ہو، اردو کے مسئلے کا قومی پہلو واضح ہو، یہ ثابت ہو کہ جمہوریت کے فروغ کے لئے اقلیتوں کا مکمل اطمینان ضروری ہے اور اس اطمینان کے لئے اکثریت کا یقین دلانا کافی نہیں، خود اقلیت کا احساس ضروری ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ اردو کے مسئلے کو صرف مسلمانوں کا سوال بنانا اور اسے مذہبی رنگ میں پیش کرنا بالکل غلط بات ہے۔ یہ ایک قومی مسئلہ ہے۔ یہ صرف مسلمانوں کا نہیں، ہندوؤں، عیسائیوں، سکھوں، پارسیوں کا بھی مسئلہ ہے جن کی یا تو اردو مادری زبان ہے یا جن کی ادبی زبان ہے یا جنھیں اردو عزیز ہے۔

۲۶ جنوری کے دن ہمیں ایک بار پھر عہد کرنا چاہئے کہ ہم اپنی جمہوریت کو جس کی عمر ابھی صرف چودہ سال ہے اور جو نوعمر کہی جا سکتی ہے، شباب کی منزل تک لے جائیں گے، ہم اپنی ترقی کی رفتار کو تیز کریں گے۔ ہم مذہب، زبان، علاقے، نسل کی بنا پر نہ تفریق کریں گے نہ تفریق برداشت کریں گے۔ ہم اپنے فرائض بجا لائیں گے اور اپنے حقوق پر اصرار کریں گے۔

اس اشاعت میں

ہم ہمسایہ ملکوں کی کسی غلط بات کا اثر نہ لیں گے، کسی کے اشتعال دلانے سے مشتعل نہ ہوں گے، کسی کے ڈرانے سے خوف زدہ نہ ہوں گے۔ ہم نے جو اپنی منزل مقرر کی ہے اُس کی طرف استقلال سے گامزن رہیں گے۔ ہم اس کی کوشش کریں گے کہ جہاں جہاں کوتاہی یا سُستی یا غلطی نظر آئے اُس کی خاموشی سے اصلاح کریں اور جب اگلا یوم جمہوریت آئے تو ہم کہہ سکیں کہ ہماری ترقی کی رفتار پہلے سے بہت تیز ہے اور ہماری منزل ہم سے اور قریب ہو گئی ہے۔

ظہیر الدین علوی

افسوس ہے کہ ۱۲ جنوری کو سید ظہیر الدین علوی رجسٹرار جامعہ اُردو کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم علی گڑھ کے ایک ممتاز اولڈ بوائے اور شعبۂ اُردو کے ایک فعال رُکن تھے۔ عرصے سے وہ جامعہ اُردو کی خدمت کر رہے تھے اور سنہ ۱۹۵۸ء میں شعبۂ اُردو کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے پورا وقت جامعہ اُردو کی نذر کر دیا تھا۔ اُن کی ان تھک محنت کی وجہ سے جامعہ اُردو کا کام بہت بڑھا اور پھیلا اور اُس کے امتحانات کی وجہ سے اُردو ادب کا مطالعہ بڑھا اور اُردو کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ آج جامعہ اُردو، اُردو کے اداروں میں ایک اہم اور نمایاں مقام رکھتا ہے اور ساری اُردو دُنیا اُسے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ علوی صاحب مرحوم کو کئی سال ہوئے دل کی تکلیف ہوئی تھی، مگر علاج کے بعد اچھے ہو گئے تھے۔ ابکے پھر وہی تکلیف ہوئی اور اس بیماری سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ خدا سے دُعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنی رحمت بے پایاں سے سرفراز کرے۔

ہمیں یقین ہے کہ جامعہ اُردو کے ارباب اختیار علوی صاحب کا مناسب جانشین مقرر کریں گے تاکہ یہ ادارہ نہ صرف اپنے مفید کام کو جاری رکھ سکے بلکہ اس میں اور اضافہ کر سکے۔

مستشرقین کی چھبیسویں (۲۶) بین اقوامی کانگریس کے موقع پر

ماہنامہ جامعہ کا مخصوص نمبر

۴ جنوری سے ۱۰ جنوری تک دلّی میں مستشرقین کی چھبیسویں (۲۶) بین اقوامی کانگریس منعقد ہوئی تھی، جس میں بہت ہی اہم مسائل اور موضوعات پر مقالے پڑھے گئے اور بحث و گفتگو ہوئی۔ ماہنامہ جامعہ میں اس اجلاس پر ایک تفصیلی تبصرہ شائع کیا جا رہا ہے اور اسکے بعض اہم مباحث پر مثلاً مسلم پرسنل لا اور مستشرقین کی اُردو خدمات وغیرہ پر مضامین بھی شائع ہوں گے۔ شمارہ وسط فروری کو شائع ہو جائے گا۔

مُلّا صاحب کے تیسرے مجموعۂ کلام کی اشاعت

اُردو کے ممتاز اور صاحب فکر شاعر پنڈت آنند نرائن مُلّا کا تیسرا مجموعۂ کلام "میری حدیثِ عمرِ گریزاں" شائع ہو گیا ہے۔ اس میں مُلّا صاحب کے تازہ کلام کے علاوہ 'جوئے شیر' اور 'کچھ ذرّے کچھ تارے' کا انتخاب بھی شامل ہے۔ کتاب چار سو صفحے کی ہے۔ اس کی قیمت آٹھ روپے پچاس نئے پیسے ہے، اور مصنف یا اُردو کے کتب فروشوں سے مل سکتی ہے۔

جشنِ سالگرہ

عوامی لائبریری 'صاحب گنج' کی پانچویں سالگرہ بتاریخ ۳ جنوری سنہ ۱۹۶۴ء بوقت چھ بجے شام کو مشاعرے کی ابتدا سے منائی گئی، جس کی صدارت شری شیو بالک رائے، پرنسپل، صاحب گنج کالج نے فرمائی۔ مقامی و بیرونی شعراء کرام میں، ماہر بریلوی، اکرام انجم، محی الدین غنی، جمال پھلواروی، شاغل قادری، ابراہیم ہمایوں کوکب، شعلہ غازی پوری، ایوب صابر اور کمال الدین صدیقی نے اپنے کلاموں سے سامعین کو نوازا۔ آخر میں صدر محترم نے کافی مؤثر تقریر کی اور سکریٹری کے شکریہ کے الفاظوں کے ساتھ مشاعرے کی کارروائی دس بجے شب میں بحسن و خوبی انجام پائی۔

پنجاب یونی ورسٹی کے وظائف

(بحوالہ ٹائمز آف انڈیا) پنجاب یونی ورسٹی نے ان پنجابیوں کو وظیفے دینے کا فیصلہ کیا ہے جو دوسری یونیورسٹیوں میں جدید ہندوستانی زبانوں کی تعلیم حاصل کریں گے۔

یہ پہلی یونی ورسٹی ہے جس نے قومی یکجہتی کی کونسل کی سفارشات پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ شروع میں بنگالی، مراٹھی، تامل، تلیگو زبانوں کی تعلیم کے لئے ہر طالبعلم کو دو سو روپیہ ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ آہستہ آہستہ دوسری زبانوں کی تعلیم کے لئے بھی اس اسکیم میں مزید توسیع کی جائیگی۔

ہندوستانی عوامی گیتوں کا انسائیکلوپیڈیا

(بحوالہ ٹائمز آف انڈیا) معلوم ہوا ہے کہ حکومت ہند نے ہندوستانی عوامی گیتوں کا ایک انسائیکلوپیڈیا شائع کرنے کی تجویز کی ہے۔ اس انسائیکلوپیڈیا کے ساتھ ہی سنسکرت، بدھ مت اور جین دھرم کے قصّے کہانیاں اور دیو مالائی داستانوں کی ایک فہرست مضامین بھی شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ ڈاکٹر بی۔ کے۔ باروا (جو بین الاقوامی مستشرقین کانگریس میں شرکت کر رہے ہیں) نے کہا کہ انسائیکلوپیڈیا کا کام شروع ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر محمود الٰہی

شیخ محدث دہلوی کی نایاب کتاب

ہندستان میں اسلامی علوم کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں وہ صرف حدیث اور اصول حدیث کے منتہی نہیں تھے بلکہ انکی خدمات و اکتسابات تفسیر و تجوید سے لے کر منطق و فلسفہ تک ہر شعبۂ علم میں قابل قدر ہیں۔ ان کی اخبار الاخیار، مدارج النبوۃ، جذب القلوب الی دیار المحبوب کی اہمیت کبھی کم نہ ہوگی۔

ہمارے یہاں جب جدید اصولوں کی روشنی میں تحقیق کا کام شروع ہوا تو پروفیسر خلیق احمد نظامی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے اس عہد آفریں شخصیت پر قلم اٹھایا اور "حیات شیخ عبدالحق دہلوی" ہمارے سامنے پیش کرکے وقت کے ایک اہم تقاضے کو پورا کیا۔

نظامی صاحب نے اپنی اس تصنیف میں نہ صرف شیخ محدث کی تصانیف کی فہرست پیش کی ہے بلکہ ان کے موضوعات کا لحاظ رکھتے ہوئے الگ الگ ابواب میں ان کا اجمالی جائزہ بھی لیا ہے۔ انہوں نے ان کی ہر تصنیف کے سلسلے میں اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ اس کے نسخے ملتے ہیں یا نہیں۔

تصانیف کی فہرست میں نظامی صاحب نے "نکات العشق و محبت" کا بھی ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس کی زبان فارسی اور اس کا موضوع تصوف ہے لیکن اپنے انداز تحقیق کے برعکس انہوں نے نہ تو اس کے مشتملات پر بحث کی ہے اور نہ اس کی تصریح کی ہے کہ یہ کتاب ان کی نظر سے گزری یا نہیں یا اس کا قلمی نسخہ کہیں ملتا ہے یا نہیں۔ مجھے گورکھپور میں نکات العشق کا ایک قلمی نسخہ ملا ہے[1] جس کے مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ نظامی صاحب نے ثانوی ذرائع پر اعتماد کرکے اس کتاب کا ذکر فہرست تصانیف میں کیا ہے۔ اگر یہ کتاب ان کی نظر سے گزرتی یا اس کے مشتملات کے سلسلے میں اگر وہ تحقیق کر لیتے تو محدث دہلوی کے ابتدائی حالات اور ان کے افکار کی رفتار ترقی کے بارے میں انھوں نے جو معلومات بہم پہنچائی ہیں ان میں ایک حد تک ترمیم و اضافہ کر لیتے۔

محدث دہلوی نے "نکات الحق" نام کی جو کتاب یادگار چھوڑی ہے اس کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

> "لڑکپن اور کھیل کود کے زمانے میں میں نے عشق مجازی کے بیان میں لڑکوں کی طبیعت کے موافق ایک کتاب لکھی تھی اسکا نام نکات العشق رکھا تھا لیکن یہ نکات اور عالم کے ہیں اور حقیقت کی طرف ان کا رخ ہے۔"
> (لطائف الحق ترجمہ اردو نکات الحق ص۲)

نکات الحق کے دیباچے کے یہ الفاظ اگر ایک طرف نکات العشق کے تعارف کا حق ادا کرتے ہیں تو دوسری طرف اس کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ محدث دہلوی کے تذکرہ نگار اور نقاد کے نزدیک اس کی اہمیت کیوں اور کتنی ہے۔ نکات العشق کے دیباچے میں محدث دہلوی نے اس کی وجہ تالیف پر کھل کر بحث کی ہے اور اس حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا ہے کہ اس کا تعلق یکسر عشق مجازی سے ہے۔ در اصل نکات العشق اور نکات الحق محدث دہلوی کے میلان قلب اور افتاد طبع کے دو روپ ہیں اور ان دونوں کو سامنے رکھ کر ہی ان کی شخصیت کے نقوش ترتیب پا سکتے ہیں۔ اس کتاب کی اہمیت صرف اس لئے نہیں ہے کہ اس سے ان کے لڑکپن اور کھیل کود کے زمانے کے خیالات ہمارے سامنے آ جاتے ہیں بلکہ کتاب کے دیباچے اور اس کے مشتملات سے یہ یقین ہوتا ہے کہ یہ ان کی آپ بیتی ہے کتاب میں کئی جگہ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں اسے کوئی اچھا کام نہیں کہا جائے گا بلکہ اس کی وجہ سے ان پر ملامت کی جائے گی، لیکن چونکہ یہ ان کے دل کی باتیں ہیں اس لئے اسے چھپانا بھی مناسب نہیں۔

علمائے دین اور صوفیائے کرام نے شعر و ادب کی جو خدمت کی ہے اس پر یہاں بحث کرنا مقصود نہیں۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ پہلے زمانے میں نصاب تعلیم کچھ اس طرح مرتب کیا جاتا تھا کہ ہر طالب علم کو شعر و شاعری سے دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔ اور اکثر حالات میں یہ دلچسپی شعرگوئی پر آمادہ کر دیتی تھی۔ محدث دہلوی کی شاعرانہ حیثیت بہت بلند نہ سہی لیکن اتنا تو سب جانتے ہیں کہ وہ شاعر بھی تھے اور حقی تخلص کرتے تھے۔ ان کا دیوان ایک عرصے سے نایاب ہے اور موجودہ زمانے میں جبکہ مخطوطات کے مطالعے اور ان کی فہرست سازی کا ذوق کافی ترقی کر چکا ہے ان کے چند اشعار ہی منظر عام پر آ سکے ہیں نکات العشق کی اہمیت اس حیثیت سے اور بڑھ جاتی ہے کہ اس میں متعدد ابیات، قطعات اور رباعیات کے علاوہ ان کی ۲۹ غزلیں بھی ملتی ہیں اور ہر غزل کے مقطع میں تخلص بھی استعمال کیا گیا ہے۔ نکات العشق کے اشعار کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ان کے قلبی واردات کی نمائندگی کرتے ہیں محدث دہلوی نے خود لکھا ہے کہ اس عشق میں مختلف اوقات میں ان پر جو کچھ گزرتی تھی، وہ اشعار کے قالب میں ڈھل جاتی تھی، اور اس کتاب میں وہی اشعار حسب موقع فراہم کر دئے گئے ہیں۔ یہاں نکات العشق سے کچھ غزلوں کے اشعار نقل کئے جاتے ہیں تاکہ محدث دہلوی کا رنگ شاعری پہچانا جا سکے۔

۱؎ سید ہاشم علی سبزپوش کے کتب خانے میں یہ کتاب محفوظ ہے۔

انتخاب کلام

شب فراق کہ از ہجر یار می گریم
بہانہ درد کنم زار زار می گریم
بہر کجا کہ بود مائے روم آنجا
بدیں بہانہ ز ہجر نگار می گریم
چو عندلیب خزاں دیدہ در نشیمن باغ
بہ ہجر روئے تو اے گل عذار می گریم
ہمیشہ روز و شب از درد و غم چو حقی زار
ز درد و فرقت یار و دیار می گریم

برفت و مملکتِ دل خراب و ویراں کرد
اسیر بند فراق و کمند ہجراں کرد
برفت آنکہ چو مہر سپہر روشن بود
جمال خود بہ نقاب فراق پنہاں کرد
برفت آنکہ بطوفِ حریم او بودم
مقیم گوشۂ درد و حریم حرماں کرد
خیال دیدن او سوئے من بوقتِ وداع
چگونہ صبر کنم بے رخش چو نتواں کرد
مگو کہ صبر بکن در فراق او حقی
دلِ حزین مرا ناتوان و حیراں کرد

دیگر اندر غم تو صبر ندارم چکنم
چہ کنم چوں نبود صبر و قرارم چکنم
زور و زر مایۂ عشاق بود در ہمہ جا
زر ندارم چکنم زور ندارم چکنم
گرچہ صبر از چو تو بدخوئے بود نیک ولے
من بے صبر اگر تاب ندارم چکنم
حقی اندر سر زلفش چو مقید گشتم
گر گرہ افگند آں شوخ بکارم چکنم

مارا رخ زیبائے تو دیدن نگذارند
حرفے ز زبانِ تو شنیدن نگذارند
کوئیت ز سرشکم چو گلستاں شد و لیکن
یک گل ز گلستانِ تو چیدن نگذارند
محرم نتواں شد بہ حریم حرم تو
چو بر سر کوئے تو رسیدن نگذارند
کے غنچۂ شوق دلِ حقی بگشاید
بویش چو نسیم تو وزیدن نگذارند

جاں برفت و مہر آں نامہرباں در جاں ہنوز
دل ز دردش مبتلا و درد بے درماں ہنوز
عمرہا شد کز طریق دل گزشت آں شاہ حسن
کشور جان و دل از بیداد او ویراں ہنوز
تن ز سوز ہجر خاکستر شد و بر باد رفت
داغ سودائے کہ در دل داشتم سوزاں ہنوز
گوش بر افغان آں بیداد گر ہرگز نکرد
حقی از بیداد او در نالہ و افغاں ہنوز

نکات العشق کا سال تصنیف سنہ [illegible]ھ ہجری ہے اور زیر بحث نسخے کی کتابت ۱۱ رجب المرجب سنہ [illegible]ھ کو ختم ہوئی اس کے کاتب سید مصلح الدین شیفتہ ہیں جن کا تعلق دربار محمد شاہ سے تھا۔ کتاب ایک سو بیس صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحے میں پندرہ سطریں ہیں۔ میرے علم کے مطابق نکات العشق کا یہ پہلا قلمی نسخہ ہے جس کا تعارف کرایا جا رہا ہے۔

مشترکہ رسم خط

(ہندوستان ٹائمز کے مراسلہ نگار کے حوالے سے) بھارتی سنگم کی تقریب سنگ بنیاد کے موقع پر وزیر اعظم پنڈت نہرو نے ادب کی نشو و نما اور تمام زبانوں کو ایک رشتے میں منسلک کرنے کے لئے ایک مشترکہ رسم الخط کی وکالت کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ پُر زور لفظوں میں یہ بھی کہا ہے کہ مشترکہ رسم خط کا یہ مطلب نہیں کہ دوسری زبانوں کو دبایا جائے۔

یہ خیال قابل تعریف ہے اور تیس سال سے اس پر ناکام بحث بھی چھڑی ہوئی ہے۔ ایک طرف ہمارے وزیر اعظم اور دوسرے ماہرین تعلیم ایسے جامع رسم خط کے متعلق کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں جو مختلف زبانوں کے رسم خط کی جگہ لے سکے۔ مگر دوسری طرف کچھ ریاستوں کے محکمۂ تعلیم نے اب سے دس سال پہلے ہی سندھی زبان کے لئے دیو ناگری رسم خط ٹھونسنے کا جلد بازی میں فیصلہ صادر کر دیا۔ لیکن اس رسم خط نے جو سندھی زبان کے عربی رسم خط کا بدل ہونے کے لئے قطعی نامناسب اور ناکافی ہے اب تک کوئی ترقی کر کے نہیں دکھائی۔ بلکہ نامکمل حالت میں اس امید پر اس کا استعمال شروع کر دیا کہ آگے چل کر وہ کوئی جادو کا کام کر دکھائے گا۔ وزیر اعظم کے خیالات کے خلاف محکمۂ تعلیم کے کارکنوں نے اس سلسلے میں جبر و تشدد سے کام لیا اور اس کی کوئی پروا نہیں کی اُن کی جلد بازی سے متعلقہ زبان کا گلا گھوٹا جا رہا ہے۔

(گوپی چند اڈوانی)

خضر برنی

یومِ آزادی

نوائے دل بڑی مشکل سے ساز گار ہوئی
ہماری بات زمانے میں باوقار ہوئی
کچھ اپنی خفتہ مزاجی جو ہوشیار ہوئی
بہار آئی چمن میں خزاں فرار ہوئی
ہماری اپنی حکومت ہمارا ہے دستور
کہ آج ہم سے غلامی ہے دُور کوسوں دُور!

ہمارا راج، ہمارا سماج، سب کچھ ہم
ملے ہیں شیخ و برہمن خوشی سے پھر باہم
جگائے عزم تو ہاتھوں میں آگیا ہے دم
کریں گے دیش کی رکھشا نہیں ہے اب کچھ غم
یہی ہے ہولی دیوالی یہی ہے یومِ عید
یہی ہے یومِ مسرت یہی ہے روزِ سعید

ہوئی چمن میں عجب طور سے یہ گل کاری
ہزار رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے پھلواری
ہر ایک گام پہ چشمے سے ہوگئے جاری
زمینِ ہند پہ فطرت کی ہے ضیا باری
کسان جھوم اُٹھے کھیت لہلہانے لگے
ہر ایک شاخ پہ جلوے سے مسکرانے لگے

نشاطِ روح کے آثار ہوگئے پیدا
ترنگے جھنڈے کا عنوان اس طرح چمکا
نمودِ صبح نے اندازِ تیرگی بدلا
چمن میں نور کی کرنوں کا ہوگیا ڈیرا
زباں پہ سعیِ مسلسل کی بات آئی ہے
نگاہِ شوق نے منزل کی راہ پائی ہے

یہ ریگ زاروں کا منظر حسین صحنِ چمن
عزیز تر ہے گلستاں عزیز برگ و سمن
ہماری وادیٔ کشمیر اور گنگ و جمن
ہمالہ، تاج، اجنتا ہیں آبروئے وطن
ہر ایک فردِ وطن کا ہوا ہے اب مسرور
کچھ ایسی شان بہ اندازِ نو ہوئی مستور

قدم قدم پہ نئے دیپ جگمگائیں گے
وطن کی شان بہ اندازِ نو بڑھائیں گے
ترانہ عزم و عمل کا خوشی سے گائیں گے
زباں پہ اپنی شہیدوں کا نام لائیں گے
یہی ہے اپنی حکایات و واردات کا دن
یہی ہے دَورِ غلامی سے اک نجات کا دن

ہر ایک طور بڑھائیں گے ہم وطن کا وقار
ہماری جان تصدق، ہمارا دل ہے نثار
کھلے ہیں غنچے چمن میں، سماگئی ہے بہار
ہم اپنے دل سے یہ کرتے ہیں آج قول و قرار
خیال دل سے وطن کا مٹا نہیں سکتے
فریب گردشِ دوراں سے کھا نہیں سکتے

(قومی جنگ کا ادبی محاذ)

پیروڈی

صادق تھولی

شکر

(فیض احمد فیض سے معذرت کے ساتھ)

لیڈر، بو شہر زندگی تیرا، شکر کس طور سے ادا کیجے!
اسپتالوں کا کچھ شمار نہیں، تندرستی کا کیا گلا کیجے!
وہ جو "رکنڈ" کے فقیر ہوئے، ان کو تشویش روزگار کہاں؟
دعوتیں دے کے نوکری لیں گے، اس سے خوش وقت کاروبار کہاں؟
نظم چھیڑی تو اٹھ گئی محفل، منت طبع غم گسار کسے؟
سر اسٹیج ہو گئی ہوٹنگ، بے سُروں کا خیال یار کسے؟
بے نصیبی کہ چشم و دل کی مراد، دَیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
غیظ کیں "پکش بات" کی پہنچے، ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے
دورِ ایٹم "ہے آج کا انساں، لاکھ تسخیر کائنات کرے
پھر بھی اس کے سوا نہیں چارا، ڈالڈا کھائے جلی بات کرے

قیصر شمیم

آرتی

لے اے دیوی آشاؤں کی!
ایک پجاری لے آیا ہے
ٹوٹی 'تھالی' ٹوٹے دل کی
جلتی سانسوں کے کچھ دیپک'
روتی آنکھوں کا 'گنگا جل'
بکھرے سپنوں کی 'مالائیں'
'دھوپ' اپنے من کی پیڑا کی
آہوں کے کچھ 'گیت' انوکھے
برہم کے اُجلی بھاؤ کا 'چندن'
ممتا کا 'پرساد' نرالا
ایک پجاری لے آیا ہے
لے اے دیوی آشاؤں کی!!

بشیر احمد شہید

غزل

فکر آزاد ہے اخلاق کی زنجیروں سے ۔۔۔ ظلمتیں بڑھ گئیں افکار کی تنویروں سے
عقل تدبیر کے امکان سے آگے نہ بڑھی ۔۔۔ اپنی دیوانگی ٹکرا گئی تقدیروں سے
کتنے خود ساختہ رہبر کہ کرم ہیں ان پر ۔۔۔ پوچھئے ٹھوکریں کھائے ہوئے رہگیروں سے
ان دنوں چشم ہوس یوں بھی بہل جاتی ہے ۔۔۔ خوابگاہوں میں سجائی ہوئی تصویروں سے
ان کی آنکھوں میں بھی آ ہی گئے آخر آنسو ۔۔۔ دل کے جذبات میں ڈوبی ہوئی تقریروں سے
پارسا بن کے بھی زاہد نہ بچے پر نہ بچے ۔۔۔ ان کی تقدیریں لکھی ہوئی تقصیروں سے

کتنے دلکش تھے شہید اپنے سہانے سپنے
خواب ہی خوب تھے موہوم سی تعبیروں سے

روئداد مشاعرہ

مورخہ ۳ جنوری ۱۹۶۳ء بروز جمعہ شب میں قصر الادب مالیگاؤں کا طرحی مشاعرہ شوکت پریس میں منعقد ہوا۔ مندرجۂ ذیل شعرائے کرام نے اپنے اپنے کلام سے مشاعرے کو کامیاب بنایا۔

صدر مشاعرہ حضرت اثر قادری بینانگری، کلیم شفائی، احمد نسیم بینانگری، محشر مصطفیٰ آبادی، تاباں مالیگانوی، محمود ایولوی، زین العابدین عابد، مقبول انجم، محسن مرسیپوری، ندیم ادیبی، شوق برہان پوری، جامی بلڈانوی، رعنا ادیبی، عزیز ادیبی، نہال انصاری، احمد شاکر، شاکر ادیبی، جاوید ادیبی، یگانہ ادیبی، پرویز ادیبی اور محسن ادیبی۔

بزم ادب جھنجھنوں۔ راجستھان

دفتر بزم ادب جھنجھنوں میں طلبہ کا ماہانہ پروگرام زیر صدارت جناب ریوتی لال شاہ میکنیکل انجینئر کلکتہ بڑے اہتمام سے منایا گیا۔ یہ پروگرام ایک تقریری مقابلہ تھا جس میں مقامی ۱۲ اداروں کے علاوہ ضلع و بیرونجات کے طلبہ و اساتذہ نے بھی حصہ لیا تھا۔ تقریر کا عنوان تھا "فروغ اُردو ہندوستان کے اتحاد کا باعث ہے" تقریر کرنے والے طلبہ سینئر اور جونیئر دو گروپوں میں منقسم تھے۔ تقریریں بڑی پُرجوش اور بصیرت افروز رہیں۔ تقسیم انعامات کے بعد سکریٹری ادارہ نے ایک مختصر اور فاضلانہ تقریر میں ادارے کی خدمات کا مختصر سا خاکہ پیش کیا۔ انہوں نے بتایا کہ قیام بزم ادب کے بعد زبان و ادب کی جو اشاعت ہوئی ہے وہ قصبے کی تاریخ میں بے مثال ہے۔

جلسے کی اختتامی تقریر صدر جناب ریوتی لال شاہ نے فرمائی جس میں ادارے کی خدمات اور کارناموں کو سراہا گیا۔ نیز صاحب موصوف نے تالیوں کی گونج میں اپنے آپ کو اس ادارہ کا لائف ممبر بننے کا اعلان فرمایا اور مبلغ یک صد روپیہ نقد ادا کیا۔

شاندار انعامی انٹر اسکول مباحثہ

۲۹ دسمبر ۱۹۶۲ء بروز اتوار بوقت ۱۰½ بجے دن مدرسہ اسلامیہ مومن پورہ کے ہال میں "بزم شعر و ادب" کی جانب سے اعلیٰ پیمانے پر ایک انعامی انٹر اسکول مباحثہ جناب مقصود الحسن صاحب ڈپٹی ڈائرکٹر آف اسٹیشنری کی صدارت میں منعقد ہوا۔

مڈل اور ہائی اسکول کے لئے عنوان الگ الگ رکھے گئے تھے۔ جج صاحبان کے فیصلے کے بعد صدر جلسہ نے طلبہ کو انعامات تقسیم کئے۔ اس کے بعد صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں طلبہ کی ہمت افزائی کرتے ہوئے بزم شعر و ادب کی خدمات کو کافی سراہا۔ جناب صدر کی تقریر کے بعد بزم کے صدر جناب عبدالقادر نیازی صاحب نے صدر جلسہ، مہمان خصوصی اور حاضرین جلسہ کی خدمات میں ہدیۂ تشکر پیش کیا۔

قاضی عبدالستار

مُشاعرہ اور اُردو ادب

مرقع تہذیب کے خالق مغلوں نے دربار کو ادبی حرمت عطا کرنے کے لیئے اپنی سرکار سے شاعر وابستہ کر لیئے۔ ان شاعروں کو باریابی کا شرف بخشنے والی محفلیں پھیلتے پھیلتے مشاعرہ بن گئیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے دربار سے بازار اور بازار سے خانقاہ تک مشاعروں کا جال بچھ گیا۔ اس عہد نے جو تبلیغ و ترسیل کے وسائل سے ایک حد تک نا آشنا تھا مشاعروں کو ایسا ادارہ بنا دیا جو ایک طرف تو شاعروں کی ادبی قدر و قیمت کا تعین کرنے لگا۔ اور دوسری طرف برائے نام مدت میں کثیر التعداد انسانوں تک خیالات کی تبلیغ کرنے لگا۔ صوفیائے کرام شعر کی دل سے منزلت نہ کرتے ہوئے بھی اپنے پیغام کی ترسیل کے لیئے مشاعروں کو منھ لگانے لگے۔ عوام جو تاج کے غلام اور سجادے کے مُرید تھے مشاعروں کی اہمیت اور فضیلت کا شکار ہو گئے۔

ان مسائل کی آویزش نے مشاعروں کو ادبی اکھاڑہ بنا دیا۔ ان اکھاڑوں میں جیتنے والے دربار کی سرپرستی خانقاہ کی منزلت اور بازار کی مقبولیت کے مستحق قرار پائے۔ اس دور میں مشاعروں نے کچھ ادبی اور تہذیبی خدمتیں بھی سرانجام دیں۔ اس ادارے نے بزرگوں کی حُرمت ہم چشموں کی عزت اور خوردوں کے ساتھ شفقت کی تعلیم دی ہے۔ محاورے اور روزمرہ کا استعمال سکھایا ہے۔ ایک ایک لفظ ایک ایک مضمون کو دس دس رنگ سے باندھنے اور برتنے کا سلیقہ بتایا ہے۔ تشبیہ تلمیح اور استعارے کو ضرب المثل بنا دینے کے آداب اور گُر بتائے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ اس ادارے نے اُردو زبان اور ادب کو زبردست نقصان بھی پہنچایا ہے۔

مشاعروں کے وجود نے خواص اور عوام کے کانوں کی اس طرح تربیت کی کہ وہ الفاظ کے ظاہری محاسن زبان کی آرائش اور لہجے کے بانکپن محاورے اور روزمرہ کی کھنک اور صنایع و بدایع کے آہنگ پر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ اس طرح زبان کی خوبصورتی اور زبان پر قدرت کا معیار اتنا پُرتکلف اور پُرتصنع ہو گیا کہ وہ سیکڑوں الفاظ جو زبان کے ارتقا کی قدرتی رفتار کے ہاتھوں زبان کے ہاتھ لگے تھے مردود قرار پائے اور قتل کر دیئے گئے۔ زبان ایران سے قریب اور ہندوستان سے دور ہوتی چلی گئی۔

سامع کے ذہن پر سماعت نے اس حد تک غلبہ حاصل کر لیا کہ وہ شعر کے باطن میں چھپے ہوئے جواہر کو پرکھنے کی مصیبت جھیلنے کے بجائے شعر پر لپٹی ہوئی زبان کی چاشنی اور شعر میں دھڑکتی ہوئی خیال کی شوخی اور گدگدی پر ہی قناعت کر کے بیٹھ گیا جس کا دور رس نتیجہ یہ ہوا کہ اُردو شاعری کا دفتر سنجیدہ، مفکرانہ اور پُرمغز شاعری سے ایک حد تک خالی رہ گیا۔

مشاعرے اس حد تک شاعر کے حواس پر حاوی ہو گئے کہ شاعری کی وہ اصناف جن کی طوالت مشاعرے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی مر گئے۔ مثنوی جیسی مقبول صنفِ سخن کا ایک حد تک غائب ہو جانا اس دعوے کی دلیل ہے۔

جب مشاعرے کی کامیابی معاشی مسائل کے حل کی ضمانت بن گئی تو مقابلہ اور سخت ہو گیا۔ مشاعرہ دنگل بن گیا کُشتیاں ہونے لگیں اور پگڑیاں اُچھلنے لگیں۔ ہجو یہ شاعری جو سماج کی بڑی خدمت کر سکتی تھی ذاتیات میں پڑ کر گالی گلوج کرنے لگی۔

اگر بات یہیں تک رہتی تو کوئی خاص افسوس نہ ہوتا لیکن مشاعروں نے اُردو نثر کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ تمام نثر نگاروں نے شاعری پر للچائی ہوئی نگاہ ڈالی ہے۔ یہ لالچ ایک نفسیاتی گرہ ہے' جس کا کھولنا ضروری ہے۔ یہ لالچ اور یہ مرض مشاعروں کی دین ہے مشاعرے کا ادارہ اُردو ادب پر اس سرے سے اس سرے تک چھایا ہوا تھا۔ اس ادارے اس اسٹیج سے بلند کی ہوئی آواز کو اپنی ساری کم مائگی کے باوجود انتہائی قلیل مدت میں قبول عام کا انعام مل جایا کرتا تھا۔ اسے اس طرح سمجھیے کہ ایک بہترین صلاحیت رکھنے والا ادیب دس برس کے ریاض کے بعد نثر کی ایک کتاب لکھتا ہے جسے پڑھے لکھے لوگوں کی بہت چھوٹی اقلیت پڑھتی ہے۔ اس اقلیت میں بہت کم لوگ ایسے نکلتے ہیں جو اپنی پسندیدگی کے اظہار کو تحریر کی صورت میں مصنف تک پہنچاتے ہیں۔ اس طرح مصنف کو اپنے کارنامے کا اجر بڑی دیر میں اور بہت چھوٹی مقدار میں نصیب ہو پاتا ہے۔ دوسری طرف معاملہ برعکس ہے یعنی ایک تیسرے درجے کی صلاحیت رکھنے والا شاعر مشاعرہ میں غزل پڑھنے جاتا ہے۔ مشاعرے میں بادشاہ اور مُرشد اور ہزاری اور بزاری سب شامل ہیں۔ مشاعرہ داد دینے پر تُلا بیٹھا ہے۔ اس لیے کہ اوسط درجے کے شعر پر بھی داد دینا مشاعرے کے آداب میں داخل ہے۔ شاعر اپنے بزرگوں' دوستوں' عزیزوں اور خوردوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انسان کے باطن میں چھپے ہوئے جذبات مروت و محبت کو مہمیز کرتا ہے۔ پھر اداکاروں کی طرح جسم کے مختلف حصوں کو مختلف حرکات سکھا کر گلے میں گھنگھرو باندھ کر تیسرے درجے کی غزل پڑھتا ہے۔ کسی صفِ اوّل کے سامع نے اگر غلطی سے بھی "واہ" کر دی تو وہ کم فہم لوگ، جن کی اکثریت ہوتی ہے اور نقالی جن کا وطیرہ ہوتی ہے تقلید میں چیخ اُٹھتے ہیں اور مشاعرے میں ایک غلغلہ مچ جاتا ہے اور سارا مشاعرہ داد سے بھر جاتا ہے اور شاعر راتوں رات مشہور ہو جاتا ہے۔ بادشاہ مُرشد اور عالموں کی نگاہ میں چڑھ جاتا ہے۔ پھر جب دوسرے مشاعرے میں یہی تیسرے درجے کا شاعر انھیں سامعین کے سامنے پہنچتا ہے تو سامعین کی آنکھوں میں اس شاعر سے

بالبتہ داد ناچ جاتی ہے اور وہ فطری طور پر پہلے سے بھی زیادہ مستعد ہو کر سُنتے ہیں اور واہ واہ کرتے ہیں اس ہنگامے میں وہ خوش فہم لوگ بھی جبلی طور پر شامل ہو جاتے ہیں جو مشاعرہ سُننے آتے ہیں تمغے بانٹنے نہیں آتے۔ پھر یہی خوش فہم لوگ جو ادب میں دخل رکھتے ہیں اپنی بخشی ہوئی داد سے انصاف کی خاطر اس معمولی شاعر کو ادب کی محفل میں داخل کر لیتے ہیں۔ مشاعروں میں "چلنے" والی غزلیں ایسی سطحی ہوتی ہیں کہ ایک صفِ اوّل کی ادبی صلاحیت رکھنے والا انسان چلتے پھرتے موزوں کر سکتا ہے پھر وہ بھلا کیوں اپنی تبلیغ کے اتنے بڑے ادارے سے اپنے آپ کو چھپائے رکھے۔ یہ مشاعرے ہی کا جادو تھا جس نے سرسید جیسی عظیم الشان ہستی کے نام کے پیچھے "آہی" کا دم چھلا لگا دیا۔ محمد حسین آزاد نے تخلص کا ارتکاب کیا۔ شررؔ سے شاعری سرزد ہوئی۔ شبلی شعر کہتے پائے گئے۔ رسوا اور سرشار تک اس حمام میں دیکھے گئے۔ آج اس زمانے تک میں سید احتشام حسین غزلیں موزوں کر رہے ہیں اور سید سجاد ظہیر نظمیں (ٹھنڈی نظمیں) لکھ رہے ہیں۔ اس کا اثر عوام پر یہ ہوا کہ وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ ادبی حرمت شعر کے واسطے سے نصیب ہوتی ہے۔ اس تاثر نے ان خام ذہنوں کو چکمہ دیا جو نثر کے شاہکار لکھنے کی صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے۔ لیکن سستی شہرت کے لالچ میں تیسرے درجے کی شاعری کر کے تباہ ہو گئے۔

ماضی قریب میں "مشاعرے" کا طلسم ٹوٹا ہے اور رسالے ان کی جگہ لینے لگے۔ اس صورتِ حال سے شاعری پر کاری ضرب لگی ہے۔ یعنی سُنی ہوئی شاعری جب کاغذ پر آئی تو خرافات معلوم ہونے لگی اور شاعر کی قدر و قیمت جس پر مشاعروں کی داد کی قلعی بھی کُھل گئی۔ نثر کو چمکنے کا موقع ملا۔ اور رسالوں کے وسیلے سے ایک حد تک مصنف کو اس کا انعام ملنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی بار اُردو ادب میں ایسی شخصیتوں کا ہجوم ہوا جن کے دامن شاعری کی تہمت سے پاک تھے۔ اگر مشاعرہ اُردو ادب پر مسلط نہ ہو جاتا تو ایسی ادبی ہستیاں بہت پہلے وجود میں آ جاتیں اور اُردو ادب کی رہنمائی کی زمام ان ہاتھوں میں پہنچ جاتی جن کا نثر کے عہد کو انتظار تھا۔

ہندوستان کو وہ دوسری زبانیں جو ابھی کل تک اُردو زبان سے پچھڑی ہوئی تھیں، آج میلوں آگے نکل گئی ہیں یا نکلی جا رہی ہیں۔ دراصل اس لئے بھی اتنی تیزی سے ترقی کر سکیں کہ ان کے راستے میں "مشاعرے" کے پہاڑ حائل نہ تھے یعنی ان زبانوں میں ادبی قدر و قیمت کے میزانوں کا انحصار سماعت پر نہیں تھا۔ ذہن پر تھا۔ اسی لئے ان زبانوں میں شعری ادب کے ساتھ ساتھ نثری ادب نے بھی خاطر خواہ ترقی کی ہے اور اُردو ادب کے برعکس دنیا کی دوسری مہذب زبانوں کی طرح ان پر نثر نے غلبہ حاصل کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں ہندی اور بنگالی کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اپنے دلوں سے یہ گمان نکال دیں کہ مشاعرہ بھی اُردو ادب کی ترقی کا موجب بن سکتا ہے۔

"یومِ انیس"

یومِ انیس بتاریخ ۱۰ر نومبر ۱۹۶۳ء ۴ بجے شام "دربار حسینی" میں شاندار پیمانے پر منایا گیا۔ کارروائی کا آغاز اُردو کے نامور شاعر میر انیس کی تصویر کی رسمِ نقاب کشائی سے عمل میں آیا۔ نواب عنایت جنگ بہادر نے نقاب کشائی کے موقع پر کہا کہ میں امید کرتا ہوں کہ آئندہ سال تک اُردو کے عظیم المرتبت شاعر میر انیس کی یادگار میں ایک وسیع ہال بنایا جائے گا۔ مسٹر نرسنگ راؤ سابق وزیر اعلیٰ نے اپنی افتتاحی تقریر میں حاضرین پر زور دیا کہ وہ عظیم شاعروں کے فکری تخلیقات کی روح اور عظمت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ پروگرام کا آغاز میر انیس کے کلام سے کیا گیا جس نے ساری محفل میں ایک سماں باندھ دیا۔ مولوی نور الحسن صاحب ایم اے نے اپنے مقالے میں میر انیس کی زندگی کے چند اہم واقعات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے انیس کے سماجی پہلوؤں کا اپنے مقالے میں جائزہ لیا۔ واقعاتِ کربلا کو بلا مبالغہ فنِ شاعری کے کمال پر پیش کرنے میں پروفیسر حسن عسکری نے میر انیس کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ انیس کے کلام میں کردار نگاری، واقعہ نگاری اور منظر کشی کے چند نمونے پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر جعفر حسن نے میر انیس کو اُردو کا عظیم المرتبت شاعر قرار دیا۔ جناب باقر امانت خانی، جناب ساجد رضوی اور شاعرِ قوم جناب علی آفندی نے منظوم خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے میر انیس کے کلام کی اُردو زبان میں اہمیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ میر انیس نے اُردو شاعری کی ایسی صنف میں طبع آزمائی کر کے اس کو معراجِ کمال پر پہنچایا جس کو اس زمانے میں نہایت فرسودہ خیال کیا جاتا تھا۔ اور اُردو زبان کو اس قابل بنایا کہ وہ دنیا کی دوسری اہم زبانوں کے مقابلے میں امتیاز حاصل کر سکے۔

اسی روز رات میں ایک شاندار مشاعرہ (طرحی) بھی منعقد ہوا جس میں آندھرا پردیش کے ممتاز شعراء نے اپنا کلام سُنایا، علامہ نجم آفندی نے صدارت کی۔

ضروری اعلان

براہ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ منیجر

مصطفیٰ علی گڑھ

غالب اور ثلاثۂ غسّالہ: تعقّل، تعشّق اور تصوّف

۲۲ر دسمبر ۱۹۶۳ء کو "ہماری زبان" پر غالب کی سنطق تھی، آج کی صحبت میں منہ کا مزہ بدلنے کے لئے اُن کے دیوان سے چند جام علمت، محبّت اور معرفت کے پیش کرتا ہوں، امید ہے کہ اہل عقل، اہل عشق اور اہل دل بھی کو یہ مرغوب ہوں گے۔

دور اندیشی کے صلاح کار کہتے ہیں کہ تقوی ظاہر کے مفتی اور بدگمانی کے قاضی کہیں تیری تکفیر و تشہیر نہ کر دیں، نہیں صاحب میں تو اُن کے تاکستان سے ایسی شراب کھینچ رہا ہوں جس میں غفلت ہے نہ مستی، نہ شہوت ہے نہ خود پرستی، وہ شراب ظاہر تو نجس ہے اور حرام اور یہ شراب معنی طیّب طاہر ہے اور دل آرام، وہ زہر ہے یہ تریاق، وہ مرض ہے یہ شفا، وہ جفا ہے یہ وفا، وہ خمار ہے یہ تامتر سرور، وہ نار ہے یہ سراپا نور، وہ مزیل عقل ہے اور یہ مکمل، وہ فاصل ہے اور یہ واصل، بس یہ راح بھی ہے، رَوح بھی ہے، روح بھی ہے، محو بھی ہے، صحو بھی ہے اور صبوح بھی ہے، ؎

سقانی الحبُّ کاساتِ الوصالِ
فقلتُ لخمرتی نحوی تعالی

مصطفیٰ اب تعلل نہ کرو، "نوشیدن" کا مصدر گردانو، اور نوشا نوش کی آواز لگاؤ۔

۱؎ ہاں نہیں وہ وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں؟

۲؎ جب وہ جمال دل فروز صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں؟

۳؎ دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوک ناز بے پناہ
تیرا ہی عکس رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں؟
(مُفتَعِلُن مَفَاعِلُن، مُفتَعِلُن مَفَاعِلُن)

کہاں ہے امرؤ القیس وہ عرب کا مایۂ ناز شاعر، تشبیب تغزّل کا ماہر، وہ جو ریگستان محبّت میں ناقۂ بلاغت پر سفر کرتا پھرتا ہے کوئی اس سے کہہ دے کہ حُسن بیان کے ساقی پُرفن ترک شیرازی مرزا غالب دہلوی کے دورِ سخن میں شریک ہو جائے۔

قسم ہے فصاحت اور اس کے انداز کی اور بلاغت اور اس کے ایجاز کی بلکہ نظم قرآنی کے اعجاز کی کہ انصاف کا جوہری تنقید کے کانٹے میں امرأ القیس کے مشہور قصیدہ کا مطلع رکھ کر مرزا غالب کے اس "ہاں نہیں" سے موازنہ کرے تو یہی کہنا پڑے گا کہ ؎

غالب نکتہ داں سے کیا نسبت　　خاک کو آسماں سے کیا نسبت

سُنئے، وہ صحرا نورد چلا جا رہا ہے اور اُس مقام پر اس کا گزر ہوتا ہے جہاں کبھی پہلے، کسی سابق سفر میں، اس نے قیام کیا تھا، اور لوگ بھی تھے، کچھ کہیں کے کچھ کہیں کے، یہی گویا وہ جنگل ہے جہاں اس نے منگل منایا تھا، کسی کی آنکھوں سے درس محبّت لیا تھا اور اپنا سی پارۂ دل دیا تھا، پھر جب فراق کی کڑی گھڑی آگئی تھی تو ان لوگوں نے اپنے اپنے خیمے اکھاڑ کر اپنا اپنا راستہ لیا تھا، اس جمعیت کا شیرازہ بکھر گیا تھا اور اس گلدستہ کے پھول منتشر ہو گئے تھے، بے دل کہیں تو دلدار کہیں، گل کہیں تو خار کہیں، ؎

آں سفر کردہ کہ صد قافلہ دل ہمرہ اوست
ہر کجا ہست خدایا بسلامت دارش

اللہ اکبر! دنیا میں کیسے کیسے انقلاب آتے رہتے ہیں، اور سچ پوچھئے تو سب سے جاں فزا و جاں کاہ انقلاب اس حیات و ممات کا ہے جس کو اہل محبّت کی زبان میں وصال و فراق کہتے ہیں، ؎

وہ صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

یا اللہ! میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا، کہنا تھا کیا اور کیا کہہ گیا، ہاں تو جب امرؤ القیس اس مقام محبوب پر ہو کر گزرتا ہے تو پرانی محبت نئی یاد سے تازہ ہو جاتی ہے باسی کڑھی میں اُبال آجاتا ہے، اور دل کی بے قراری میں اپنے رفقائے سفر سے کہتا ہے۔ ع

قِفَا نَبْكِ مِنْ ذِكْرَى حَبِيبٍ وَمَنْزِلِ

یارو! ذرا ٹھہر جاؤ، آؤ ہم سب مل کر یہاں رو لیں، یہ وہی شبستان راحت ہے جہاں ہماری پیاری شمع کبھی رو چکی ہے، اُڑ لا چکی ہے، ہنس چکی ہے، ہنسا چکی ہے،

ناظرین غور فرمائیں کہ امرؤ القیس وہاں خود ٹھیرنا چاہتا ہے تو دوسروں کو بھی ٹھیراتا ہے، رونا چاہتا ہے تو دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیتا ہے۔ یا للعجب! محبوبہ تو اس کی اور روئیں دوسرے بھی، وہ اس کے رقیب تو نہیں جو خود روئیں۔ یا کرایہ کے ٹٹو نہیں جو پیاز کا عرق لگا کر اپنی آنکھیں دھوئیں، کوئی مجھے سمجھا دے یہ بھی کوئی غیرت ہے کہ دوسروں کو اپنی محبوبہ کا ہمراز کرے ہمباز کرے، لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

عربیّت کے شیدائی ناچیز مصطفیٰ کی عجمیّت پر آنکھیں نہ دکھائیں کہ چھوٹا منہ بڑی بات۔ بھلا امرؤ القیس کی غلطی نکالتے۔ بات یہ ہے کہ "انظر ما قال" پر نظر رکھیں، اور "من قال" ہی اگر منظور ہے تو امام باقلانی کی تنقید کا چشمہ لگا کر اس تحریر کو ملاحظہ فرمائیں نہ اب ہمارے شیر کے اس شعر کو لیجئے یعنی مرزا اسد اللہ خاں غالب کا مطالعہ فرمائیے۔ ؎

ہاں نہیں وہ وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی،
جس کو ہو دین و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں؟!

مرزا کوچۂ یار میں اپنے دین تقلیدی کو، اپنی جاہ و جان کو، قربان کر چکے ہیں، اپنی آبرو کو اس کی خاک میں ملا چکے ہیں، اس لئے نہ انھیں دل کی پروا ہے نہ سر کی، نہ جان کی نہ جگر کی، ایک جذبۂ عشق ہے اور غالب، ایک غلبۂ یاد ہے اور طالب۔

عشق وہ مرض ہے کہ نہ سقراط کے باوا سے جائے نہ بقراط کے دادا سے، مسیحا کے مطب میں بھی اس کا علاج معلوم! طبیبوں نے بہت سے چٹکلے نکالے ہیں، بہت سی تدبیریں کی ہیں، یاقوتی چٹاتے ہیں، ماء الجبن پلاتے ہیں، باغ و راغ کی سیر کراتے ہیں، لب جو بار و شکار سے دل بہلاتے ہیں لیکن نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ع روغن بادام خشکی می نمود، یہ وہ دق ہے کہ پہلے ہی درجے میں ناقابل علاج ہو جاتی ہے، وہ زخم ہے جو پہلے ہی دن ناسور بن جاتا ہے، انجکشن لگاؤ بے کار، عکس ریز کرو بے سود، جنتر منتر تنتر یہاں سب دھرے جاتے ہیں، عشق کا جن پڑھا لکھا جن ہے، حُسن کی پری نہیں جو کسی حاضرات سے شیشے میں اُتر آئے۔

اچھا مردوں کے علاج تو یوں ناکام ہے، اب عورتوں کی ڈاکٹری سُنیئے، یہ فرقہ ماشاء اللہ حسن تدبیر اور تدبیر حسن دونوں میں بہت مشاق ہے، اور یہ اب ہی نہیں جب کہ کالج کی تعلیم نے اور سونے پر سہاگا کر دیا ہے بلکہ اگلے وقتوں میں بھی اس "جنس لطیف" کی "صنف نازک" میں کچھ ایسی کمی نہ تھی۔

لہٰذا عاشق کے علاج کے لئے بعض بڑھیاں یعنی مکر و نفاق کی پڑیاں بیڑا اُٹھاتی ہیں اور اُسے محبوب کی بُرائی اور بے وفائی کے دفتر کے دفتر سُناتی ہیں کہ میاں اپنی جوانی کو خاک میں کیوں ملاتے ہو اور ایسے کے لئے جو کافر ہے ستمگر ہے،... چُنیں ہے چُناں ہے!!! تمہاری جان بھی جائے گی اور ایمان بھی، نہ دین کے رہو گے نہ دُنیا کے، کس عیّار کے پھندے میں پڑے ہو۔ ذرا ہوش کے ناخن لو، عقل کی آنکھیں کھولو۔

اب غالب کے پاس خواہ کوئی ایسی ہی "مائی" آئی ہو یا ایسی ہی مائی کا اُس جیسا پوت "آیا ہو"، یہ مجھے تحقیق نہیں، تاریخی ریسرچ کرنے والے اس کا سُراغ لگائیں کیونکہ پاتال تک کا پتہ لگانا اور قلم کی ٹھوکر سے مُردوں کو جلانا وہ خوب جانتے ہیں، اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں اور اس میں شک بھی نہیں کہ اُس نے پند و نصیحت کے وار کرنے میں اور ملامت کی ضرب کاری لگانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا ہو گا۔

"محبوب وفا پرست نہیں، وہ بے وفا ہے" یہ خلاصہ ہے اُس کے وعظ کا اور لب لباب ہے اس لیکچر کا، اور غور فرمائیے تو عاشق کا دل بیزار کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کارگر نہیں ہو سکتا کیونکہ عاشق وفادار ہے اور قاعدہ ہے کہ الجنس یمیل الی الجنس، لہٰذا عقل کا تقاضا ہے کہ وہ بھی طبعاً محبوب سے طالب وفا ہو، پس جب اُسے یقین کامل ہو جائیگا کہ محبوب بے وفا اور باجفا ہے تو عاشق کا جذبۂ وفا بھی سرد و مضمحل ہوتا چلا جائے گا، اور چونکہ عشق کے لئے وفا لازم ہے، اس لئے جب ادھر وفا گئی تو اُدھر عشق بھی گیا، اذا الشئی ثبت ثبت بلوازمہ، نہ لازم رہا نہ ملزوم۔

تدبیر تھی معقول، میں بھی مانتا ہوں، اور تقریر تھی با اصول، میں بھی جانتا ہوں، لیکن اس کا کیا علاج کہ ؎

شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

عاشق تھا کامل اور عشق کا جن تھا عامل، لہٰذا اُس نے ایک دُتکار بتائی کہ جاؤ جاؤ ہم بحث نہیں کرتے، مناظرہ طالب حق سے کیا جاتا ہے، اور طالب نفس سے مجادلہ و مکابرہ کرنا اہل حق کی شان سے بعید ہے۔ ؎

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خو چو بگذشت بر عارف جنگ جو
گر ایں مدعی دوست بشناختے بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

تم محبوب کو قدر دان محبت نہیں بتاتے، اچھا یہی سہی، میں اس پر اتنا اضافہ اور کرتا ہوں کہ وہ دشمن وفا ہے، لیکن بایں ہمہ میں اس کی گلی کی خاک ضرور چھانوں گا، اور تمہاری خاک نہیں مانوں گا، تمہیں اپنا دین و دل عزیز ہے، مجھے اپنا دلدار عزیز ہے، تمہیں وہ مبارک، مجھے یہ مبارک، وہ رستہ تمہارا، اور یہ رستہ میرا، اللہ اللہ خیر صلّا۔

اب ذرا یہ بھی ملاحظہ فرمائیے کہ امرؤ القیس وہاں جا نکلا تھا، غالب آئے دن آتے جاتے رہتے ہیں، گویا "کوچۂ دلدار کے ساکن" ہیں، امرؤ القیس کے معین و مددگار ساتھ ہیں، سب کو ساتھ لے کر رونا اور گانا یہ آسان ہے، غالب تنہا ہیں اور راہ دوست میں دشمن کا مقابلہ پامردی سے کر رہے ہیں، یہ ٹیڑھی کھیر ہے، وہ وہاں جاکر چار آنسو بہاتا ہے اور حساب کے قاعدے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہایا بھی ہو گا تو پانچ، کیونکہ وہ دوست ساتھ ہیں، اگر اُن بے چاروں نے بھی برابر کا چندہ دیا ہو گا، تو نتیجہ اس تقسیم کا آپ خود سمجھ لیں، رہے ہمارے مرزا یہ کوئے یار پر اپنے دین و دل کو نثار کر چکے، انصاف شرط ہے، ایمان سے کہیے کس کا عشق صادق، کس کا جذبہ کامل۔

جذبات عشق اور معنی و بیان کے لحاظ سے تو فرق کا پردہ روئے حقیقت سے اُٹھ گیا، اب زبان کو بھی دیکھ لیجئے امرؤ القیس عربی ہے اور غالب عجمی، عربی کا کیا کہنا عجمی اسکے

سامنے گونگا، لیکن جو شخص روح القدس سے اپنے کلام کی داد پاتا ہے بے شک اس میں یہ حلاوت و روانی ہے کہ گویا کانوں میں جوئے شہد کی لہر بہر آگئی، امرؤ القیس کا کلام خرمائے عرب ہے (قصور معاف) زیادہ شیریں نہیں، پھر اس کے یہاں دو فقرے اور مرزا کے یہاں دو چھوڑ چار چار۔

مجاز کا پردہ اُٹھانے پر شعر کی قیمت اور نمایاں ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طالب صادق یا سالک راہ خدا کو منزل سلوک سے بھٹکانے کے لئے بعض انسانی و جنّی شیاطین آتے ہیں، اور اسی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں کہ کسی طرح وسوسوں سے اس کے جذبات نیک کو کمزور اور فنا کر دیں، کوئی کہتا ہے کہ مجاہدہ کی زکوٰۃ سے سرمایۂ حیات فنا ہو جائیگا کوئی کہتا ہے کہ کعبۂ مقصود کے حج میں تعلقات طبعی سے فراق جانکاہ ہوگا، طالب صادق نفس و شیطان کی اس "سخف عف" کو اہمیت نہیں دیتا اور ایک چلتا ہوا جواب دے کر اپنا دامن عافیت بچا کر نکل جاتا ہے کہ لکم دینکم ولی دین۔ سے

در راہِ عشق وسوسۂ اہرمن بسیست
ہش دار و گوش دل بہ پیام سروش دار

(باقی بہ دور باقی)

دلّی یونی ورسٹی میں اُردو مذاکرہ اور نمایش کتب

دلّی۔ ۱۰ر جنوری ۱۹۶۴ء شعبۂ اُردو دلّی یونی ورسٹی کے زیر اہتمام ۹ر اور ۱۰ر جنوری ۱۹۶۴ء کو اُردو ادب کے سلسلے میں مستشرقین کی خدمات کے عنوان سے ایک "اُردو مذاکرہ" (سمپوزیم) منعقد ہوا۔ دلی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر سی ڈی دیش مکھ نے "مذاکرے" کا افتتاح فرمایا اور اپنی تقریر میں کہا: "اردو کم از کم ہندستان کے پچاس ملین افراد کی زبان ہے اور ہندستانی زبانوں میں اس اعتبار سے بڑی ہے کہ اس کا اپنا ایک متعین اور مقررہ اسلوب ہے۔ جب کہ دوسری زبانیں مختلف بولیوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ آپ نے مستشرقین کی خدمات پر بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ یورپ اور ہندستان کے بعض پڑوسی ملکوں میں لاکھوں مخطوطات محفوظ ہیں اور ان پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔

پہلے اجلاس میں پروفیسر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر ولفریڈ لولی اور ڈاکٹر کرومر نے مشہور جرمن مستشرق ڈاکٹر اشپرنگر کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر کرومر نے دلّی یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کو ٹیوبن گن (جرمنی) کے مخطوطات کے مطالعہ کے لئے جرمنی آنے کی دعوت دی۔ پروفیسر ڈاکٹر فاروقی نے اپنے مقالے میں اشپرنگر کی مرتب کردہ "فہرستوں" کا جائزہ لیا اور بتایا کہ ان میں زبان و ادب کی تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے معلومات کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔

دوسرا اجلاس (۱۰ر جنوری) کو فرانس کے مشہور مستشرق پروفیسر ژین فلیوزا کی صدارت میں ہوا، جس میں انیسویں صدی کے فرانسیسی مستشرق موسیو گارساں دتاسی اور مشہور برطانوی مستشرق ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ لیا گیا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے مقالے میں گارساں دتاسی کے خطبات و مقالات اور اس کی مرتب کردہ تاریخ ادب سے بحث کی اور بتایا کہ اس کی تصانیف میں دراصل ۱۸۵۰ء سے لے کر ۱۸۷۷ء تک کے ہندستان کی سچی تصویر اور اس دور کے سیاسی و تہذیبی ہندوستان کی جھلک ملتی ہے۔

پروفیسر فلیوزا نے اپنی تقریر میں گارساں دتاسی کے علمی کارناموں کے پس منظر پر روشنی ڈالی، اس کے بعد جناب صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنے مقالے میں ڈاکٹر جان گلکرسٹ کے علمی و ادبی کارناموں کا جائزہ لیا اور بتایا کہ اس کی تاریخی اہمیت و تحقیق کے اصول، زبان و انداز بیان کے سلسلے میں اس کے نظریات اور لغت و قواعد کی ترتیب میں اصول و ضوابط کے بنیادی اصول کارفرما ہیں، اور اس طرح گلکرسٹ کو ایک عہد آفریں شخصیت قرار دیا۔

آخر میں پروفیسر سیمون ڈگبی (کیمبرج) نے ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی علمی خدمات پر ایک مقالہ پڑھا جس میں فورٹ ولیم کالج میں ڈاکٹر موصوف کی خدمات سے بحث کی اور اُردو ادب کی ترقی میں ان کے مرتبہ کا تعین کیا۔

سمپوزیم کا آخری اجلاس ۱۲ر جنوری ۱۹۶۴ء کو سات بجے شام ہوا جس میں روسی مستشرقین نے شرکت کی۔

اس مذاکرے کے سلسلے میں "کتابوں کی نمایش" کا انتظام دلّی یونیورسٹی لائبریری کی وساطت سے کیا گیا تھا جس میں اُردو کے مایہ ناز مستشرقین و اساتذہ شعبۂ اُردو کی تصانیف پیش کی گئی تھیں۔ (سکریٹری شعبۂ اُردو دلّی یونیورسٹی، دلّی)

ہندی میں مقدمات کا داخلہ نامنظور

(بحوالہ ٹائمز آف انڈیا) جالندھر۔ مسٹر ایچ۔ بی۔ گور سینیر سب جج نے مسٹر لال چند کے اس اپیل کو خارج کر دیا جو انھوں نے سب جج راجشور داس کے فیصلے کے خلاف دائر کیا تھا۔ یہ مقدمہ لال چند نے پنجابی علاقے کی عدالتوں میں ہندی میں مقدمات کے داخلے کے حق کو بحال کرانے کے لئے پیش کیا تھا۔

سینیر سب جج نے سب جج کے اس فیصلے کی تائید کی کہ پنجابی علاقے میں مقدمات ہندی میں پیش نہیں کئے جاسکتے۔

پنڈت سندر لال کی حق گوئی

۲۸ دسمبر ۱۹۶۳ء کو انجمن ترقی اُردو ڈاسنہ کے زیر اہتمام حاجی عبد الرحمٰن صاحب کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس میں انجمن شبینہ اسکول ڈاسنہ کے طلبہ نے نظمیں سُنائیں اور ایک ڈرامہ بھی پیش کیا۔ اس موقع پر جناب پنڈت سندر لال صاحب نے جو تقریر فرمائی وہ حق گوئی اور صدق بیانی کی زندہ مثال ہے۔ انجمن ترقی اُردو ڈاسنہ کی سرگرمیوں کو سراہتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ اٹھارویں صدی کے شروع تک دہلی سے الہ آباد تک کھڑی بولی بولی جاتی تھی۔ مگر انگریزوں نے یہاں آکر تفریق کی بنیاد رکھ دی۔ فورٹ ولیم کالج اگرچہ کھڑی بولی کی ترقی کے لئے قایم کیا گیا تھا مگر ہندو مسلمانوں میں لڑائی کا بیج بھی وہیں بویا گیا۔ ہندی اور اُردو کے عالموں کو نوکر رکھ کر ناگری اور اُردو رسم خط میں کتابیں لکھوائی جاتی تھیں۔ ہندی کے ادیبوں سے اُردو کے عام لفظوں کو بدل کر سنسکرت میں لکھنے کو کہا جاتا تھا۔ آپ نے ہندو بھائیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہر زبان اللہ کی دین ہے۔ انسان کی بولی ہے اس کو دشمنی کا ذریعہ کیوں بنایا جائے۔ آپ نے الہ آباد کا ایک واقعہ بتایا کہ کالی داس کے جنم دن کے موقع پر میرے ایک دوست پروفیسر صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ اُردو کی بڑی حمایت کرتے ہیں مگر اس زبان میں فحش باتیں بہت ہیں۔ میں نے برجستہ اُن سے کہا کہ آپ آج جس کا جنم دن منا رہے ہیں اُس کے صفحے کے صفحے فحش باتوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

کالی داس کی کتابوں میں ایسی ایسی فحش باتیں بھری پڑی ہیں کہ باپ اپنی بیٹی کو اُن کا مطلب نہیں سمجھا سکتا۔ ہر زبان میں اچھی اور بُری باتیں ہوا کرتی ہیں۔ آپ نے ۱۹۰۸ء سے تحریک آزادی میں اپنی شرکت اور نو دفعہ جیل جانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اُردو زبان ہی نے تحریک آزادی میں جان ڈالی۔ سارے ملک کو اس نے ایک رشتے میں جوڑ دیا۔ گذشتہ پچاس سال میں آزادی کے اوپر جتنا اُردو میں لکھا گیا ہے اتنا کسی اور زبان میں نہیں۔ ہندی ایک نظم بھی ایسی پیش نہیں کر سکتی۔ آزادی کے لئے اُردو نے جو خدمات انجام دی ہیں، بُھلائی نہیں جا سکتیں۔

میں ہندی کو چیلنج نہیں کر رہا بلکہ آپس میں پریم کا پرچار کر رہا ہوں۔ ملک میں اُردو کا بھی حصہ ہے۔ اسے بھی جینے دو۔ میں تمہیں نہیں روکتا تم مجھے کیوں روکتے ہو۔ کسی چلتے پھرتے مزدور سے پوچھو وہ عمر کا مطلب سمجھے گا یا آیو کا۔ قلاقند عام لفظ ہے اس کا نام دُگدھ مشٹھان۔ قلی کو بھار واہک اور تھانے کو آرکشالیہ۔ اسی قسم کے سیکڑوں اچھے خاصے لفظوں کو بدل کر عجیب عجیب قسم کے لفظ گھڑے جا رہے ہیں۔ بھائیو! ایسی تو زبان بولو جس کو سب سمجھیں۔ کسی زبان سے نفرت اچھی نہیں۔ تم جو چاہے زبان بولو مگر مجھے تو میری زبان بولنے دو۔ ہندوستان کی زبان وہی ہندوستانی ہو سکتی ہے جس کو سب سمجھ سکتے ہوں۔ یہ سب ہندو مسلمانوں کی بنائی ہوئی زبان ہے۔ جنتا کی بنائی ہوئی زبان ہے۔ اینٹ کے شَبد شُدھ الفاظ ٹھونسنے سے زبان نہیں بنتی۔ زبان کو جنتا کا گلا بنایا کرتا ہے۔ آپ نے زوردار لہجے میں کہا کہ انگریز نے پھلجھڑی چھوڑ کر ہمارے گھر میں آگ لگا دی۔ ہم کو آپس میں لڑا دیا۔ زبان کا بھید بھاؤ پیدا کر دیا۔ اورنگ زیب نے جس کو متعصب کہا جاتا ہے ہزاروں مندروں کو جاگیریں عطا کیں جن کی شہادت کے سیکڑوں فرمان میں نے دیکھے ہیں۔ مغلوں کی حکومت میں ہندو مسلمانوں کے برتاؤ بالکل بھائی برادری کے تھے۔ آپ نے ایک مثال دی کہ میری دادی میری پھوپی کو دہلی سے ایک مسلمان بدھو خاں کو بھیج کر بلوایا کرتی تھیں۔ پنڈت جی کی اس موقع پر اس تقریر کا سامعین پر بڑا اثر ہوا۔

سیاست داں کپڑوں کی پروا نہیں کرتے

لندن میں کپڑے تیار کرنے والے ایک ادارے نے یہ انکشاف کیا ہے کہ سیاست داں سیاسی امور میں اتنے منہمک رہتے ہیں کہ وہ اپنے چہرے کی دیکھ بھال کرنا بھی بھول جاتے ہیں۔ یہ ادارہ ہر سال ملک میں بہترین لباس پہننے والوں کی ایک فہرست تیار کرتا ہے۔

چھ سال پہلے کی بات ہے یہ سیاست داں اس ادارے کی فہرست میں سب سے اوپر تھے مگر اس سال وہ پانچویں نمبر پر پہنچ گئے ہیں۔

ادارۂ مذکور نے لکھا ہے کہ کچھ مشہور سیاست دانوں کو عوام میں تقریریں کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے، ان کا لباس اتنا بُرا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ حاضر دماغ نہیں ہیں۔ لیکن عام طور پر اس سال حالت اطمینان بخش رہی۔ اور برطانیہ اب بھی وضع داری کا سب سے زیادہ خوش پوش ملک ہے۔

اس سال کی فہرست میں سب سے پہلے بینک کاروں کا نام ہے۔ دوسرے نمبر پر ایکٹر اور وکلا ہیں۔ سیاستدانوں، ڈاکٹروں، کسانوں، اخبار نویسوں، ماہرین تعمیرات اور سرکاری ملازموں کے نمبر بعد میں ہیں۔

مالک انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ، پبلشر نذیر حسن، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھپوا کر مرکزی انجمن ترقی اُردو علی گڑھ سے شائع کیا